سوال نمبر

سوال نمبر

سوال نمبر

سوال نمبر

سوال نمبر

ANS 01

بلاشبہ دنیائے انسانیت اعتقادی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، سماجی، عدالتی، تعلیمی، ثقافتی تنزلیوں کی جانب گامزن اور رواں دواں ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ لوگ ایک بار پھر زمانۂ جاہلیت کی طرف سفرشروع کر چکے ہیں۔ ہدایت کی راہیں مسدود اور ضلالت کی شاہراہیں کھلی ہیں۔ زندگی کے ہر محاذ پر مسلسل پستیوں نے انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

اطمینان نام کی کوئی چیز لوگوں کو میسر نہیں۔ جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی انسانیت مضطرب و پریشان نظر آتی ہے۔ گویا زندگی کی یہ ناؤ ڈوبنے کے قریب ہے اور اسے کسی ایسے ناخدا کی ضرورت ہے جو اسے کنارے لگائے۔

ہماری نجات اور فلاح اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرنے اور اس کی کامل اطاعت میں مضمرہے

آپ ؐ نے امانت، منصب و عہدہ اور مال و زرمیں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے

کرپشن، بدعنوانی، خیانت و سرقہ سے دنیا تھک ہار کر امانت، دیانت کی متلاشی ہے۔ الغرض دنیا ہر لحاظ سے تہی دامن ہو چکی ہے اور انسانیت کو سچی اور صحیح راہنمائی کی ضرورت ہے۔ لیجئے آسمانوں سے راہنمائی حاصل کیجئے اور پیغمبر اسلام ﷺ کے اس دوٹوک خطبہ کا ایک ایک حرف اپنے دلوں میں اُتارئیے جو 10ہجری کے9 ذی الحجہ کی دوپہر میں ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زائد صحابہؓ کے جم غفیر کے درمیان جبلِ عرفات پر دیا گیا تھا، بلاشبہ یہ خطبہ انسانی حقوق کا سب سے بہترین چارٹر، انسانی مساوات کا ضامن، قیامِ امن کا فارمولہ، معاشی ناہمواریوں سے نجات کا راہ دہندہ، معاشرتی، سیاسی، سماجی، تعلیمی، اعتقادی الغرض ہر میدان میں صحیح سمت متعین کرنے والا ایک آسمانی پیغام ہے، جسے بیان کرتے ہوئے حقوقِ انسانیت کے اس پیغامبر نے عملاً بھی مساواتِ انسانی کا درس دیا۔ جب آپؐ یہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو آپ ؐکے سب سے قریب آزاد آدمیوں کی بجائے دو ایسے غلام تھے جو غلامی سے پیغمبر اسلام ﷺ کی بدولت رہائی حاصل کر چکے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ سیاہ فام اور حبشی النسل آپ ﷺ کی اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے اور دوسرے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ آپﷺ کے وجود مسعود پر چادر تان کر سایہ کیے ہوئے تھے۔

اس خطبہ کو خطبہ حجۃ الوداع سے موسوم کیا جاتاہے۔ یہ خطبہ حدیث کی مختلف کتب میں مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متفرق طور پر منقول ہے۔ ان بکھرے موتیوں کو جمع کر کے مالہا کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ خطبہ مسنونہ کے بعد آپ ﷺ نے تقویٰ کی تاکید فرمائی ۔ ’’میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی تاکید کر رہا ہوں اور میں خیر سے شروع کر رہا ہوں‘‘۔ تقویٰ کا سب سے ادنیٰ درجہ شرک سے بچنا اور توحید اختیار کرنا ہے اور سب سے اعلیٰ درجہ دل میں سے ماسوائے اللہ تعالیٰ کے سب کو نکال دینا ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ نے خطبہ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرنے اور اس کی کامل اطاعت کا حکم دیا ہے۔ بندے کا جس قدر حق تعالیٰ سے معاملہ درست ہوتا ہے اس قدر بندہ کے معاملات درست ہوتے ہیں۔

شاید آئندہ ملاقات نہ ہو سکے: ’’اے لوگو! اللہ کی قسم، مجھے نہیں معلوم شاید آج کے دن کے بعد میں تمہیں اس جگہ نہ مل سکوں، بس اللہ اس پر رحم کرے جو آج کے دن میری بات سنے پھر اسے محفوظ رکھے‘‘۔ (سنن دارمی)

آپﷺ نے مکرر فرمایا میری باتوں کو پورے دھیان سے سنو، سمجھو یاد کرو، یاد رکھو کہ میں تمہیں وصیتیں و نصیحتیں کر رہا ہوں۔

جان و مال کا تحفظ:۔’’بلاشبہ تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں باہمی طور پر ایسے ہی محترم و مقدس ہیں جیسے یہ یومِ حج، ماہِ حج اور بلد حرام مکہ مکرمہ مقدس و محترم ہیں‘‘(صحیح بخاری)

ایک مسلمان کی جان اور اس کے مال کا احترام و اکرام مکہ مکرمہ، کعبۃ اللہ، یوم الحج ، عشرۂ ذی الحج اور ماہِ حج سے کسی درجہ کم نہیں۔سیرۃ ابن ہشام میں اس خطبہ کے آخر میں اس خوبصورت قانون کو مزید توضیح سے یوں پیش کیا گیا ہے: ’’سو کسی مسلمان کیلئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے خوش دلی سے لئے ہوئے مال کے علاوہ

کوئی مال لے۔ سو اپنے اوپر ظلم نہ کیا کرو‘‘۔حضرت امام بخاریؒ نے جان، مال اور عزت کی حرمت سے متعلق مذکورہ بالا اعلان کے ساتھ متعدد روایات میں اس قانون کی مزید اہمیت اُجاگر کرنے والے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں:

’’اور تم عنقریب اپنے رب سے جا ملو گے پھر وہ تم سے تمہارے اعمال سے متعلق سوال کرے گا، خبردار! میرے بعد گمراہی میں نہ لوٹ جانا کہ تمہارے بعض بعض کی گردنوں کو مارتے رہیں، آگاہ رہو! موجود غائب تک پہنچائے‘‘۔ (صحیح بخاری)

یعنی اگر کوئی شخص کسی کی جان و مال یا عزت و آبرو سے کھیلے گا تو اسے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بہت جلد خالقِ کائنات کی عدالت میں پیشی ہونے والی ہے، جہاں جواب دہ ہونا پڑے گا اور وہاں سفارش کارگر ہے نہ ہی رشوت کے طور پر مال و فدیہ کام آئے گا اورنہ ہی زور و طاقت بچا سکے گی، اس لئے کسی کی جان سے کھیلنے اور مال ہڑپ کر جانے سے خوب احتیاط برتو۔

ادائیگی امانت کی تاکید:’’جس شخص کے پاس کسی کی امانت ہو وہ صاحبِ امانت کے سپرد کر دے‘‘۔ (مسند الامام احمد)

امانت کی ادائیگی و پاسداری کو ایمان کی نشانی اور امانت کے ضیاع اور خیانت کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ امانت، مال اور سیم و زر، منصب و عہدہ ہو یا حکومت و اقتدار، علم و آگہی ہو یا دانش و فہم، راز ہو یا خفیہ دستاویز سبھی کا پاس رکھنا ضروری ہے۔ امانت کا پاس و لحاظ رکھے بغیر معاشرہ کبھی بھی سکون و اطمینان حاصل نہیں کر سکتا، خیانت و بددیانتی استحصال اور سلبِ حقوق کا ذریعہ ہے، جس سے طبقات میں عداوت، دشمنی اور مخالفت جنم لیتی ہے ،جو کئی بار قتل و غارت گری پر منتج ہوتی ہیں۔

جاہلانہ رسموں اور دشمنیوں کا خاتمہ: ’’سن لو ! جاہلیت کے معاملہ کی ہر چیز میرے پاؤں کے نیچے روند دی گئی ہے،جاہلیت کے تمام خون (قتل) بھی ختم کر دیے گئے ہیں(بطور نمونہ کے) سب سے پہلے میں اپنے خونوں سے ربیعہ بن الحارثؓ کے بیٹے کا خون ختم کر رہا ہوں، جو بنی سعد میں شیرخوار بچہ تھا اور اسے قبیلہ ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔‘‘(صحیح مسلم)

آپ ﷺ نے نہایت ہی بلیغ انداز سے پرانے طور و طریق، رسوم و رواج کے خاتمہ کا اعلان فرمایا۔زمانۂ جاہلیت کی قومی، لسانی، علاقائی عصبیتیں و عداوتیں، مشرکانہ افعال و اعمال، جاہلانہ ضد و عناد، توہّم پرستی، اخلاق و حیاسوز تمدن الغرض سبھی جاہلانہ عادات و حرکات و سکنات کا آپﷺ نے نہ صرف خاتمہ فرما دیا، بلکہ عملاً محبت و بھائی چارہ پر معاشرہ کی تعمیر فرما کر دشمنوں کو دوست بنایا اور آج آخر میں بطور خلاصہ و نصیحت و وصیت کے اپنے اس سابقہ پروگرام کو جامع انداز میں دلنشین کروا کر دوسروں تک یہ پیغام پہنچانے کا حکم جاری فرما دیا۔قدیم رقابتوں کے خاتمے کے باوجود کبھی کبھار پھر سے زندہ ہو کر معاشرہ کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ آپﷺ نے زمانۂ جاہلیت کے ان قتلوں کو یکسر ختم فرمایا۔آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام خون ختم فرما دیے۔

زمانۂ جاہلیت کے سود کے خاتمہ کا اعلان : ’’اور زمانۂ جاہلیت کے ہر قسم کے سود ختم کئے جاتے ہیں۔ (صحیح مسلم)

سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے: ’’تمہیں اصل سرمایہ ملے گا نہ تم کسی پہ ظلم ڈھاؤ نہ کوئی تم پہ ظلم کرے۔‘‘ (سنن ترمذی، سنن ابی داود)

معاشی نظام میں سود ہی وہ عنصر ہے جس کی وجہ سے دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں اور معیشت پر چند کمپنیوں کا قبضہ ہو جاتا ہے، اس معاشی تسلط کے نتیجے میں اشیاء کی مصنوعی قلت اور قیمتوں کی بہتات جنم لیتی ہے۔ قرضوں کے سود کی عدم ادائیگی کی وجہ سے لوگ اپنی جان اور اولاد تک کو فروخت کر دینے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ اسی سودی نظام کا لازمی نتیجہ ہے کہ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہو جاتا ہے۔ شریعت اسلامیہ نے سود کو حرام قرار دے دیا۔ سود کی حرمت کے ساتھ یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں دیے گئے قرض کا سود تو وصول کیا جا سکتا ہے، آپ ﷺنے اس ظلم کا خاتمہ فرما دیا اور اعلان فرما دیا کہ جاہلیت کے جملہ سود ختم کیے جا رہے ہیں۔

حقوقِ نسواں:’’ہاں عورتوں سے متعلق اللہ سے ڈرو کیونکہ تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت کے ساتھ حاصل کیا ہے اور تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ حلال کیا ہے... اور تمہارے ذمہ لازم ہے کہ ان کے رزق و روزی اور لباس، پوشاک کا انتظام کرو۔‘‘(صحیح مسلم)

’’اور مجھ سے عورتوں کے متعلق خیر کی وصیت قبول کرو، عورتیں تمہارے ہاں تمہاری مددگار ہیں‘‘۔(سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ)

حضرت رسول اللہ ﷺ کی ان ہدایات کو عرب کے معاشرے کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کو زندگی کا حق دیا، غلامی سے نجات دی، انسانی حقوق سے محروم اس صنف ِنازک کو باعزت و محترم بنایا، لوگوں کو خوفِ خدا دلا کر خواتین پر ڈھائے جانے والے مظالم سے منع کیا ، انہیں یہ حقیقت باور کرائی کہ تم نے انہیں اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ تمہارے لئے حلال ہوئی ہیں، گویا یہ تمہارا ملکیتی مال نہیں کہ تم ان سے باندیوں والا سلوک کرو ،یا انہیں اپنا مملوک جان کر ان میں تصرف کرو، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہارے ہاں امانت ہیں ۔ان کے بود و باش، رزق و طعام اور لباس و کپڑوں کا انتظام تمہارے ذمے ہے۔ اسلام نے عورت کو معیشت کی ذمہ دار اور کمانے کا مکلف نہیں بنایا اور اس ضعیف و نازک صنف کے بس میں ہی نہیں کہ وہ کمائے ،بلکہ ان کے تمام لوازمات مردوں کے ذمہ لگائے گئے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ حسنِ معاملہ کو آپﷺ نے اپنی خیر کی و صیت قرار دے کر اسے قبول کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور ساتھ ہی ان کا مقام و مرتبہ بتلایا کہ یہ تمہاری مددگار ہیں۔ تمہارے گھروں کی تدبیر کرنے والی ہیں۔ ان کے بغیر تمہارے خاندان اور گھرانے سبھی نامکمل ہیں۔ وہ تمہارے بغیر ذمہ داریاں کیسے سرانجام دے سکتی ہیں۔ آخر میں حضور پاک ﷺ نے باقی وصیتوں کے برعکس اس وصیت سے متعلق مزید تاکید پیدا کرنے کے لئے

فرمایا: لوگو! میری بات سمجھو میں پیغام پہنچا کر اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔

شیطان کو خوش کرنے سے اجتناب کرو:''شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا کہ اب تمہاری سرزمین پر اس کی پوجا کی جائے لیکن عنقریب اس کی اطاعت کی جائے گی، تمہارے ان کاموں کی صورت میں جنہیں تم حقیر سمجھتے ہو، تو وہ اسی پر خوش ہو جائے گا''۔ (سنن ترمذی)

حضور پاک ﷺ کی محنت ِتوحید کی برکت سے جزیرہ عرب میں ہمیشہ کے لئے شرک کا خاتمہ ہو چکا، آئندہ اس خطہ میں شرک کا شیوع نہ ہو گا، اس لئے شیطان کو بت پرستی سے تو مایوسی ہو چلی، وہ تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہوں پہ ہی خوش ہوتا ہے، لہٰذا شیطان کو خوش نہ کرو۔

ختم نبوت کا اعلان:''اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں، سنو! اپنے رب کی عبادت کرو، نماز پنج گا نہ ادا کرو، رمضان کے مہینے کے روزے رکھو، اپنے پاکیزہ اموال کی زکوٰۃ ادا کرو اور اپنے فقہاء و حکمرانوں کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ (کتاب السنۃ للألبانی)

قرآن و سنت کو تھامے رکھو: ''اور میں تم میں ایسی دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے ، وہ دو چیزیں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول پاک ﷺ کی سنت ہے۔''(مستدرک حاکم)

اسلامی اخوت اور اس کا تقاضا: ''اے لوگو! میری بات سنو اور اسے سمجھو، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اور تمام مسلمان باہم بھائی، بھائی ہیں۔ سنو! کسی آدمی کے لئے اس کے بھائی کا مال صرف اس قدر حلال ہے جتنا وہ خوش دلی سے عطا کر دے ، سنو! ایک دوسرے پہ ظلم نہ کرو، اے اللہ! میں نے یہ پیغام پہنچادیا''۔ (فقہ السیرۃ للالبانی)

میرے متعلق تم سے دریافت کیا جائے گا:اور تم سے میرے متعلق سوال کیا جائے گا، تو تم کیا کہو گے؟ سبھی گویا ہوئے ہم گواہی دیں گے کہ آپﷺ نے پہنچا دیا، امانت ادا فرما دی اور خیرخواہی فرما دی، تب آپﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی کو آسمان کی جانب بلند کرتے ہوئے لوگوں کی جانب حرکت دی اور تین مرتبہ فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہنا!(صحیح مسلم)

ANS 02

1

اردو ادب کا قصہ صدیوں پر پھیلا طویل تر ہے، تاریخ عالم کا سرا اس وقت سے جا ملتا ہے جب انسان نے اس دنیا پر بسیرا کیا اور فلسفہ یونانیوں کی اختراع ہے، ان تینوں کے ساتھ علم و حکمت، غور و فکر، عبرت و نصیحت، اختصار و جامعیت سے آراستہ و پیراستہ ایک ایسا شاہکار وجود میں آتا ہے جس کو اردو ادب کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس کا نام ہے "آواز دوست"۔

صاحب کتاب مختار مسعود ہیں جو 1926 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے، سرسید کی علی گڑھ یونیورسٹی کے ہی تلمیذ ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان عازم ہجرت ہوئے، بعد ازاں محمکۂ مالیات کے ایڈیشنل سیکریٹری بن کر بیوروکریسی

کا ایک اہم جزو رہے۔ قرار داد پاکستان کی یادگار اور پاکستان کی قومی عمارتوں میں سب سے نمایاں "مینار پاکستان" کی تعمیری کمیٹی ان ہی کے زیر صدارت چلی اور سرزمین پاکستان کو مینار کی شکل میں کلاہ نصیب ہوا۔ گزشتہ ماہ یعنی اپریل 2017ء کی 15 تاریخ کو تحریک پاکستان کے چشم دید گواہ، زمانے کے سرد و گرم چشیدہ، ادب پر مختار اور بزرگوں کے مسعود نے اس بے ثبات دنیا سے کنارہ کرلیا۔

علی گڑھ سے لاہور تک کے اس ایک دہائی کم صدی کے سفر میں اگرچہ اس صاحب طرز ادیب نے بہت کم لکھا مگر جو لکھا وہ اس قدر جامع ہے کہ اس کی ہر ہر سطر گہرائی و گیرائی کا ایک بحر ذخار ہے۔ آواز دوست جس کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "لفظ لفظ قابل داد، بعض فقرے لاجواب اور بعض صفحات داد سے بالا تر"۔ موتی ہیں کہ لٹے جاتے ہیں اور روانی ہے کہ رکتی ہی نہیں، علامہ صاحب نے رزق کو پرواز میں کوتاہی کا ایک اہم عنصر جانا مگر صاحب کتاب ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ "رزق نہیں کتابیں بھی ایسی ہوتی ہیں جس سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے"۔ اس پیمانے پر اگر "آواز دوست" کو پرکھا جائے تو نتیجہ بالعکس ملتا ہے، قاری خود کو پرواز کی اس علویت پر پاتا ہے جہاں خطرۂ افتاد کم کم ہے، قلب گہرائیوں کی نئی راہوں سے آشنا اور ذہن وسعتوں میں کہیں گم، حلاوت و شیرینی ہے کہ ہر سطر سے ٹپکتی ہے۔

خشک مغز و خشک تار و خشک پود

از کجا می آید ایں آواز دوست

دبستان رومی سے آنے والی اس صدا سے کتاب کا نام مستعار لینے والے مختار مسعود کی یہ آواز واقعی دل کو چھو لینے والی ہے، 230 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا اسلوب انتہائی خاص اور اصحاب ذوق کی سلیم الفطرتی کے عین مطابق ہے۔ یہ ایک روئداد ہے جس میں قاری خود کو مستغرق پاتا ہے اور بلندیوں کی نئی سطح سے آشنا ہوتا ہے، فلسفہ و تاریخ اور انسانی نفسیات کے پختہ شعور کے ساتھ فکر و فن کے امتزاج نے اس کتاب کو بلاشبہ اردو ادب کی ان تحریروں میں جگہ دلوائی ہے جو نایاب و کمیاب ہیں۔

موجودہ ایڈیشن پر بار اشاعت چھتیسواں لکھا ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ 1973 کو منصۂ شہود پر آنے والی اس تخلیق کا 2017 تک یہ چھتیسواں جنم ہے۔ کتاب دو مضامین پر مشتمل ہے، مینار پاکستان اور قحط الرجال، یہ مضامین اتنے ہمہ گیر و ہمہ جہت ہیں کہ نقاد ان کو یکسو ہوکر کوئی نام نہیں دے پائے۔ مضمون، انشائیے، شخصی خاکے اور مزید کئی ناموں اس کی درست ہیئت متعین کرنے کی کوشش کی گئی مگر پھر بھی ایک تشنگی رہتی ہے کیونکہ یہ ادب، تاریخ اور فلسفے کو باہم پیوست کرکے ان کے ساتھ چلتا ہے۔ بالفرض یہ انشائیے کہلائے جائیں تو بے مثل و بے نظیر ہیں کہ موضوع کی دلچسپی کو اسلوب کی چاشنی کے ساتھ دور تک لے کے جارہے ہیں۔

تربیت، شائستگی، علمیت اور معنویت سے پر انتساب میں کتاب کی فکر کو والدہ کی قبر پر اگنے والی گھاس کی پہلی پتی اور والد مرحوم کے لوح مزار کے ٹکڑے کی طرف منسوب کرکے والدین کی عظمت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مینار

پاکستان اور قحط الرجال، بظاہر بے ربط مگر بباطن مربوط ان مضامین کے متعلق خود مصنف اردو ادب کے مختصر ترین اور جامع دیباچے میں رقم طراز ہیں کہ:

"اس کتاب میں صرف دو مضمون ہیں۔ ایک طویل دوسرا طویل تر۔ ان دونوں مضامین میں فکر اور خون کا رشتہ ہے۔ فکر سے مراد فکر فردا ہے اورخون سے خونِ تمنا۔"

باہم مربوط ہر کڑی، ہر بات اور ہر پیرائیے سے ماضی حال اور مستقبل میں قاری تخیلاتی سفر کرتا، کبھی ہنستا کبھی روتا، غور و فکر میں ڈوبتا، جذبات کے طوفانوں میں گھومتا، بھولے ہوئے اسباق دہراتا تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک آنکلتا ہے۔ پوری کتاب میں تاریخ، فلسفہ، انسانی نفسیات اور ادبیت کے سنگ انشائیہ، خاکہ نگاری، آپ بیتی، تخیلاتی سفر کا یہ سلسلہ تحریک پاکستان کی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے، نکتے سے نکتہ نکلتا ہے، کڑی سے کڑی ملتی ہے اور آگہی کے نئے در وا ہونے لگتے ہیں۔

مینار پاکستان:

آواز دوست کا پہلا مضمون "مینار پاکستان" ہے۔ جب مینار پاکستان تعمیر ہورہا تھا تو اس وقت صاحب کتاب محمکۂ معاشیات میں ایڈیشنل سیکریٹری تھے اور مجلس تعمیر کے صدر بھی تھے۔ مضمون کے ابتدائی پیرایہ میں لکھتے ہیں :

"میں بلحاظ عہدہ اس مجلس کی صدارت کر رہا ہوں مگر عہدے کو ایک عہد وفا کا لحاظ بھی تو لازم ہے۔ میرے عہد کا تعلق تعمیر سے ہے، میرے عہد کا تعلق تحریک سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے سنگ و خشت کے بجائے جہان نو کی تعمیر اور افکار نو کی تعبیر سمجھا"

آگے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ تعمیری کمیٹی کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آئی کہ قرارداد پاکستان کی منظوری کی جگہ کونسی چیز بنا دی جائے جس سے کماحقہ اس تحریک کا پرتو جھلکے۔ مسجد، کتب خانہ، عجائب گھر، ہسپتال، درس گاہ یا مینار، کافی غور و خوض کے بعد مینار کے حق میں فیصلہ ہوا کہ مینار نظریاتی دفاع کی ضرورت، تحریک آزادی کی علامت، دین کی سربلندی کا گواہ اور امت مسلمہ کے تاریخ کا نشان ہے۔ رقم طراز ہیں :

"آٹھ میناروں کے ہوتے ہوئے نویں مینار کا اضافہ کسی نے حسن جانا اور کسی نے بد ذوقی۔ اس بات کو البتہ سب نے تسلیم کرتے ہیں کہ عمارت اپنی نسبت کی حیثیت سے منفرد ہے۔ دنیا میں کہیں کسی قرارداد کو منظور کرنے کی یاد اس طرح نہیں منائی گئی کہ جلسہ گاہ میں ایک مینار تعمیر کردیا جائے۔ "

ابتدائی طور پر اس مینار کو یادگار کہا گیا لیکن اس نام پر بھی تحفظات آئے کہ یادگار تو وہ نشان خیر ہے جو مرنے کے بعد باقی رہے گا اور اس سے تصور فنا کا واہمہ ابھرنے لگتا ہے اس لیے صاحب کتاب کے مشورے سے اس کا نام "مینار پاکستان" تجویز کیا گیا۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے مختار مسعود کی بلند فکری کی داد دینی پڑتی ہے کہ معاشیات جیسے خشک مضمون کے ماہر ہونے کے باوجود ادب پر اتنی گہری دسترس رکھے ہوئے ہیں کہ ایک عالم، مورخ، شاعر، مفکر، ماہر نفسیات، تاریخ دان اور انشاء پرداز نظر آتے ہیں۔ یہاں مینار پاکستان کے تعمیری مراحل

طے ہوتے ہیں اور وہاں تحریک پاکستان ترقی کے منازل سے گزرتا جاتا ہے جس کو قاری چشم تصور سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

قاری کو ایک بنیاد فراہم کرکے وہ بات آگے بڑھاتے ہوئے دور نکل جاتے ہیں اور دنیا بھر کے میناروں کو زیر بحث لاتے ہیں۔ موت کے لیے جلیل القدر مکان اہرام مصر سے لے کر ایفل ٹاور تک وہ مختلف میناروں کا تعارف کرواتے ہیں، ان کی طرز تعمیر اور مقاصد پر بات کرتے ہوئے اسلامی میناروں کا موضوع لے بیٹھتے ہیں۔ مغرب اسلام کے مربع و کثیر الزاویہ اور مشرق اسلام کے گول و نوکدار میناروں سے اسلامی تاریخ کے اہم گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس سے مصنف کی تاریخ پر گہری نظر کے اثبات کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے علوم پر عمیق مطالعہ بھی رکھتے ہیں۔ تاریخ سے وہ اپنے قاری کو بلند فکری سکھاتے ہیں اور انداز کی دلکشی، زبان و اسلوب کے مٹھاس سے اسے تھکنے نہیں دیتے۔ میناروں کے قافلے میں مینار پاکستان کا حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"مسجد بنو امیّہ کا یہ شمالی مینار آج سے تیرہ سو دو سال قبل بنا تھا۔ یہ ہمارے میناروں کا امام ہے۔ اس کے پیچھے لا تعداد مینار دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں، ایک نیا مقتدی ابھی آخری صف میں آن کر شامل ہوا ہے، اسے مینار قرارداد پاکستان کہتے ہیں۔ "

2

قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی۔ مرگ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیاتِ بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔ ایک عالم موت کی ناحق زحمت کا دوسرا زندگی کی ناحق تہمت کا۔ ایک سماں حشر کا دوسرا محض حشرات الارض کا۔ زندگی کے تعاقب میں رہنے والے قحط سے زیادہ قحط الرجال کا غم کھاتے ہیں۔

بستی، گھر اور زبان خاموش۔ درخت، جھاڑ اور چہرے مرجھائے۔ مٹی، موسم اور لب خشک۔ ندی، نہر اور حلق سوکھے۔ جہاں پانی موجیں مارتا تھا وہاں خاک اڑنے لگی، جہاں سے مینہ برستا تھا وہاں سے آگ برسنے لگی۔ لوگ پہلے نڈھال ہونے پھر بےحال۔ آبادیاں اجڑ گئیں اور ویرانے بس گئے۔ زندگی نے یہ منظر دیکھا تو کہیں دور نکل گئی، نہ کسی کو اس کا یارا تھا نہ کسی کو اس کا سراغ۔ یہ قحط میں زمین کا حال تھا۔

ابر دل کھول کر برسا، چھوٹے چھوٹے دریاؤں میں بھی پانی چڑھ آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا جل تھل ہوا کہ سبھی تر دامن ہو گئے۔ دولت کا سیلاب آیا اور قناعت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ علم و دانش دریا برد ہوئے اور ہوش و خرد مئے ناب میں غرق۔ دن ہوا و ہوس میں کٹنے لگا اور رات ناؤ نوش میں۔ دن کی روشنی اتنی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں، رات کا شور اتنا بلند تھا کہ ہر آواز اس میں ڈوب گئی۔ کارواں نے راہ میں ہی رختِ سفر کھول دیا۔ لوگ شاد باد کے ترانے گانے لگے، گرچہ منزل مراد ابھی بہت دور تھی۔ زندگی نے یہ منظر دیکھا تو کہیں دور نکل گئی، نہ کسی کو اس کا یارا تھا نہ کسی کو اس کا سراغ۔ یہ قحط الرجال میں اہل زمین کا حال تھا۔ شاعر نے جو یہ حال دیکھا تو نوحہ لکھا:

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

دل گرفتگی نے کہا ایسی شادابی اس ویرانی پر قربان جہاں مادر ایام کی ساری دختران آلام موجود ہوں مگر وبائے قحط الرجال نہ ہو۔ اس وبا میں آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ مردم شماری ہو تو بےشمار، مردم شناسی ہو تو نایاب۔ دل کی خاطر مجھے منظور تھی کہ اس کو آزردہ رکھنا کفر ہے۔ اس کی کشادگی کے بہت سے طریق ہیں جو موقع کی مناسبت سے اختیار کرتا ہوں۔

مجھے یاد آیا کہ دل جوئی کے لیے ایک بادشاہ چھپ کر اپنی پرانی پوستین سر آنکھوں سے لگاتا تھا۔ ہر شخص کے پاس اس کی پوستین ہوتی ہے مگر اکثر اس سے منکر ہو جاتے ہیں کیونکہ اسے قبول کرنے کے لیے جس جرات کی ضرورت ہوتی ہے اس کی کمیابی قحط الرجال کی پہلی نشانی ہے۔ خود فراموشی کے فریب سے بچنے کے لیے پوستین ہمیشہ سنبھال کر رکھنی چاہے اور جب دل تنگ ہو جائے یا سنگ بن جائے تو اس سے کشادگی اور گداختگی مستعار لینی چاہیے۔ میرے پاس سر و چشم پر رکھنے کے لیے چند چیزیں ہیں جو میں نے ایک بے رنگ آہنی صندوقچی میں رکھی ہوئی ہیں۔ پرائمری اسکول میں یہ میرا بستہ ہوا کرتا تھا۔ اب اس سے بہت سے کام لیتا ہوں۔ یہ کبھی پوستین ہے، کبھی چراغ اور کبھی جامِ مے۔ میں اس کی رعایت سے کبھی سبکتگین بن جاتا ہوں کبھی الہ دین اور کبھی جمشید یعنی کبھی خودشناس، کبھی دم بخود اور کبھی خود مختار۔ میرے اس بستے میں تحریروں، تصویروں اور تمغوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی البم رکھی ہوئی ہے۔

13/ ستمبر 1938 کا ذکر ہے، میں مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ والد محترم نے فرمایا کہ آج ایک چینی مسلمان عالم ہمارے گھر چائے پر آئے گا، مجھے چاہیے کہ اس سے ملوں اور اس کے آٹو گراف حاصل کروں۔ مہمان کی آمد کی وجہ سے گھر میں سب مصروف تھے مگر اس تجویز کے بعد میری مصروفیت دوسروں سے کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ نہ میرے پاس آٹو گراف البم تھی، نہ آٹو گراف حاصل کرنے کا تجربہ۔ میں اس کے آداب سے بالکل ناواقف تھا اور واقفیت حاصل کرنے کے لیے صرف دو گھنٹے ملے تھے۔ میں بازار گیا۔ ورما فوٹوگرافر کے یہاں بہت سے البم پڑے تھے۔ مجھے نیلے رنگ کی یہ چھوٹی سی آٹوگراف البم پسند آئی، جس میں مختلف رنگوں کے صفحات لگے ہوئے تھے اور جلد پر البم کا لفظ سنہرا چھپا ہوا تھا۔ اس کی قیمت صرف چھ آنے تھی۔ اس وقت بھی وہ البم مجھے قیمتی لگی اور میں آج بھی اسے بیش قیمت سمجھتا ہوں، البتہ ان دنوں وجہ کچھ اور تھی اور ان دنوں کچھ اور۔

سہ پہر جب میں نے نامانوس خال و خط کے مہمان کے سامنے اسے پیش کیا تو بڑی مانوس مسکراہٹ اور شفقت سے انہوں نے میری طرف دیکھا، کچھ باتیں ابا جان سے کیں اور قلم ہاتھ میں لے کر چینی زبان میں تین سطریں لکھیں پھر ان کا لفظی ترجمہ انگریزی میں کر دیا اور دستخط کر کے البم مجھے واپس کردی۔ میں بہت خوش ہوا

حالانکہ نہ چینی سمجھ میں آئی نہ انگریزی۔ ہر اچھے آدمی کے گرد ایک ہالہ ہوتا ہے، اس کے نزدیک جائیں تو دل خود بخود منور ہو جاتا ہے۔

آج میں روشنی کے اس حلقے میں پہلی بار داخل ہوا، اپنے اندھیرے چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ یہ خوشی کے ساتھ تعجب کی بات بھی تھی۔ اس چینی پروفیسر نے چینی زبان میں لکھنا شروع کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ سطریں اوپر سے بچے کی طرف آتی ہیں۔ چیرت اس وقت دور ہوئی جب یہ سمجھ آیا کہ ہر اچھی بات الہامی ہوتی ہے اور الہام نازل ہوا کرتا ہے۔ معزز مہمان نے چینی زبان میں میری البم میں جو کچھ لکھا تھا اس کی قدر و قیمت مجھے بہت دنوں کے بعد معلوم ہوئی اور یہ بہت سے دن میں نے ایک تلاش میں صرف کیے ہیں۔

محمد ابراہیم شاکیوچن تو دستخط کرنے اور چائے پینے کے بعد رخصت ہو گئے۔ وہ ایک طویل سفر پر نکلے ہوئے تھے اور ان کے دستخط کی بدولت میں بھی ایک طویل سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ میرا یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

شروع میں یہ بات بڑی آسانی لگی کہ کسی بڑے آدمی کے دستخط حاصل کیے جائیں گے مگر جونہی میں نے دوسرا ورق الٹا اور سوچنے لگا کہ اب کس کے آٹو گراف لیے جائیں تو بات ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے والد محترم سے رہنمائی چاہی تو ہدایت ملی کہ آٹو گراف البم کے صفحات ہوں یا زندگی کا ورق سادہ، انہیں یونہی نہیں بھرنا چاہیے۔ جاؤ نگہ انتخاب کو کام میں لاؤ، بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ ان سے تعارف کے لیے کارلائل سے مدد مانگو، ان سے ملاقات کے لیے پلوٹارک کے پاس جاؤ۔ ان کو سمجھنے کے لیے سعدی سے لے کر سیموئل سمائل تک سب کے دروازے پر دستک دو۔

راہ کا نشان اتنا واضح ملا تو سفر شروع ہو گیا۔ پہلی منزل نہ عظیم مصنف تھے نہ ضخیم کتابیں۔ یہ سفر تو بچوں کی کہانیوں کی چھوٹی سی پگڈنڈی پر شروع ہوا۔ اسکول میں انعام تقسیم ہوئے تو ایک کتاب جس کا عنوان "بہادر لڑکا" تھا، میرے حصے میں آئی۔ یہ ایک ولندیزی بچے کی کہانی تھی جو سرما کی ایک شام سمندری پشتے پر جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک چھوٹے سے سوراخ پر پڑی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ گاؤں جا کر اس کی خبر کرے گا تو اتنی دیر میں پانی کے زور سے پشتے میں شگاف ہو جائے گا اور پھر وہ ساری بستیاں اور وہ سارے کھیت جو سطح سمندر سے نیچے ہیں، غرق ہو جائیں گے۔

وہ اس سوراخ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ رات آئی تو وہ اسی حالت میں سو گیا۔ پہلے سردی اور پھر موت سے اس کا جسم اکڑ گیا مگر ننھا سا ہاتھ جوں کا توں پشتے کے چھوٹے سے سوراخ پر رکھا رہا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کا محسن ایک بہادر لڑکا ہے۔

ANS 03

اردو نثری ادب کا آغاز انیسویں صدی میں کافی میں عروج پر رہا۔ اُس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے انگریزی افسروں کو اردو سکھانے کے مقصد سے فورٹ ولیم کالج، فورٹ سینٹ جارج اور مشرقی علوم کے لیے دہلی کالج کا قیام عمل میں لایا گیا تو دوسری جانب اردو کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کے لیے افسانوی اور غیر افسانوی ادب

تخلیق کیا جانے لگا۔ اس سلسلہ میں اُس وقت کے نامور مصنفین کو ملازمتیں فراہم کی گئیں تکہ وہ آسان اور عام فہم زبان میں ادب تخلیق کریں تاکہ انگریزی افسر اردو بول چال سے واقف ہوں اور آسانی سے اردو زبان سیکھ لیں۔ یہی وجہہ تھی کہ انیسویں صدی میں اردو نثر کو فروغ حاصل ہو ا۔ اردو نثر کے آغاز و ارتقاء میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، اس کے علاوہ سرسید کی علی گڑھ تحریک نے سونے پر سہاگہ کا کام انجام دیا۔ سرسیدخود بھی ایک اچھے نثر نگار تھے انہوں نے اردو نثر فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا، سرسید نے سیکڑوں مضامین لکھے ، علاوہ اس کے اپنے ساتھیوں سے بھی لکھوایا اس طرح اردو نثر کی جدید بنیاد ڈالی گئی اردو ادب کو نثری ادب میں وسعت دی گئی۔ اردو میں نثری ادب کی مضبوط بنیاد فراہم کی گئی۔ اور اردو اردو نثر ترقی کے زینہ طئے کرتی گئی، سرسید محسنِ اردو تھے ان کا اردو نثری کارنامہ رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ ان حالات میں غیر افسانوی ادب کو استحکام نصیب ہوا۔ فروغ اردو میں کئی اصناف کا اضافہ ہوا۔ ان کی انتھک کوششوں کی بدولت اردو نثر ارتقائی مراحل طے کرنے لگی۔ اس کا سہرا سرسید اور علی گڑھ تحریک کے سر جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج اردو زبان میں نثری اصناف کا بول بالا ہے۔

اردو ادب میں اکثر نثری اصناف انگریزی ادب کے زیر اثر شامل ہوئی ہیں۔ مضمون نگاری کی ہی طرز پر نثری صنف رپورتاژ بھی انگریزی ادب سے اردو ادب میں شامل ہوئی ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے متعلق کہا گیا کہ ترقی پسندوں نے اردو کو تین تحفے دئے افسانہ، آزاد نظم، اور رپورتاژ۔ وہیں ناول کے فن کو بھی عروج کی منزلیں عطا کی۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر رپورتاژ نگاری کے فن کا آغاز ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ فن مقبول ہونے لگا۔ رپورتاژ ظاہری طور پر صحافت سے تعلق رکھتی ہے اس صنف کو نثری ادب کی صنف کا درجہ حاصل ہے۔ رپورتاژلفظ (Reportage)لاطینی اور فرانسیسی زبانوں سے اخذ کیا گیا ہے جو انگریزی میں (Report)رپورٹ کے ہم معنی ہے۔ رپورٹ سے مراد عموماً کسی پروگرام کی روداد بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ اگرکسی پروگرام یا محفل کی رپورٹ میں ادبی اسلوب، تخیل کی آمیزش اور معروضی حقائق کے ساتھ ساتھ باطنی لمس بھی عطا کیا جائے تو یہ ادبی صنف کہلائی جاتی ہے۔

اس کے متعلق ارشاد احمد خاں رقمطراز ہیں ”رپورتاژ کی پہچان اس کی اپنی ہیئت سے زیادہ اس کے اظہار میں پوشیدہ ہے۔ اس صنف میں کوئی بھی گزرا ہوا واقعہ اظہار کی تہوں تک پہنچتا اور تخلیق کار کے اندر چھپے ہوئے رومانوی احساس کو جگاتا ہے اور پھر مصورانہ چابکدستی کے ساتھ ایسی تخلیق کو اجاگر کرتا ہے جو واقعات کی لپیٹ میں مرقع کاری کا درجہ رکھتی ہے۔ رپورتاژ کو ایک غیر افسانوی صنف کا درجہ حاصل ہے جس میں افسانویت اور کہانی پن کا وجود نہیں ہوتا۔ بلکہ گذرے ہوئے واقعات کی دلچسپ انداز میں تصویر کشی ہوتی ہے ‘

رپورتاژ سے مراد کسی واقع کو دلچسپ انداز میں پیش کرنا ہے ، چونکہ یہ فن اردو ادب میں جد ید اختراع ہے لہٰذا اس کے معنی و مفہوم اور ہئیت ابھی بھی غور طلب ہے۔

پروفیسر گیان چند جین نے رپورتاژ کی تعریف اسطرح بیان کی ہے کہ ”کسی تقریب کی کاروائی کا قرار واقعی غیر ادبی، غیر جذباتی، بیان روئداد کہلاتا ہے۔ ایک انشائیہ نگار اسے بیان کرے تو ایک افسانوی، شخصی، ادبی رنگ سے بیان کرے گا۔ یہ رپورتاژ ہے جو تخلیقی ادب پارہ ہوتا ہے۔ یہ کسی تقریب، تقریب سے متعلق سفر، کسی واقعے کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں دو چار آٹھ دس دن سے زیادہ کا بیان نہیں ہوتا۔

رپورتاژ میں رپورتاژ نگار اپنے فن سے عصر حاضر کی تصویر بیان کرتا ہے۔ رپورتاژ میں ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ زندگی کے اسرار سے پردے اٹھائے جاتے ہیں۔ رپورتاژ میں واقعہ نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کے اچھے نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ رپورتاژ اپنے عہد کی دستاویز کہلا تا ہے۔ رپورتاژ کے فن اور ہئیت سے متعلق پروفیسر مجید بیدار رقمطراز ہیں۔

”رپورتاژ کے اجزاء لازم پانچ ہیں جن کے تحت کسی محفل کا ۱۔ آنکھوں دیکھا حال، ۲۔ سرگرمیوں کا احاطہ، ۳۔ منظری رویہ، ۴ہلکے پھلکے طنزیہ پیکر کا سہارا لیا جاتا ہے ، ۵۔ جس میں جزئیات نگاری کی شمولیت ضروری ہے ۔ کسی بھی رپورتاژ میں ۱۔ پیشکش کا حسن، ۲۔ واقعاتی عمل، ۳۔ تفصیل و تعبیر، ۴۔ زبان و بیان کی تخلیقی فضا، ۵۔ صحافتی عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں خبر یہ حصہ کا دخل اور روداد کی صلاحیت کار فرما ہو تو اسے ”رپورتاژ“ کے فن کی خوبی قرار دیا جائے گا۔

افسانہ اور ناول کی طرح رپورتاژ نگاری کے اجزاء ترکیبی کو باضابطہ تدوین نہیں کیا گیا۔ اردو نثر کی کتابوں میں بالخصوص رپورتاژ نگاری کے اصول، ہئیت اور اجزاء پر بہت کم ہی پیش کیا گیا ہے۔ رپورتاژ کی ہئیت اور اجزاء کیا ہو سکتے ہیں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد احمد خاں لکھتے ہیں۔

”رپورتاژ کی رپورٹ، روزنامچہ اور دیگر نثری اصناف سے ممتاز اور مہمیز کرنے کے لیے کس بھی متن میں حسب ذیل اصولوں کی جانچ ضروری ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ رپورتاژ نگاری کا فن اور اس کا اظہار حسب ذیل عنوانات کے ساتھ ممکن ہے۔ ۱)اسلوب، ۲)ہیئت، ۳)صحافت، ۴)رومانیت، ۵)افسانویت، ۶)واقعیت، ۷)قوت تحریر، ۸)اقتباسی عمل، ۹)جبریہ انداز)

پریم چند نے اپنے رپورتاژ ”پودے “ میں ترقی پسندوں کے اجلاس کی تفصیلات اور ملک راج آنند، سجاد ظہیر کی گفتگو کی منظر نگاری بہت ہی خوب اسلوب بیان میں پیش کی ہے ، مثلاً۔

"ادیبوں کے کاہن ملک راج آنند اور سید سجاد ظہیر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں براق کھدر میں ملبوس تھے۔ سجاد ظہیر کی کھدر کا رنگ سفید تھا۔ تو ملک راج آنند کا رنگ جو گیا تھا لیکن لباس دونوں کا وہی تھا۔ وہی ٹوپی وہی جواہر جیکٹ وہی پائجامہ ملک راج آنند کے منہ میں پائپ تھا تو سید سجاد ظہیر کے لبوں پر تبسم۔۔۔ آنند اور سجاد ظہیر دونوں ادبی کانفرنس کے پروگرام طئے کر رہے تھے۔ مدن گوپال جنہوں نے منشی پریم چند کے آرٹ پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے۔ اُن کے قریب بیٹھے ہوئے۔ ان دونوں ادیبوں کی گفتگو اس انہماک سے سن رہے تھے گویا کسی الہامی تفسیر سے روشناس ہو رہے ہوں۔ اسلوب رپورتاژ کی جان ہیں جس طرح افسانہ ا اور ناول میں

اسلوب کا کردار ہوتا ہے اسی طرح رپورتاژ میں بھی اسلوب کو برتا جائے ورنہ رپورتاژ اخبار کی خبر کی طرح اطلاع کا کام کرے گی اور اس کی ادبی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ رپورتاژ میں فن کار اپنے فنکاری سے روداد کو دلکش دلچسپ بنائے اور رپورتاژ جامع ہونی چاہئے

ANS 04

میناروں پر سیر حاصل بحث کے بعد وہ واپس مینار پاکستان کی طرف آتے ہیں اور اس کی بنیادوں کی مضبوطی کے لیے مشاورت کی بات سے موضوع کو آگے بڑھاتے ہیں اور قاری کو پیچھے لے جاتے ہیں جب علی گڑھ کی بنیاد رکھی جارہی تھی۔ وہ علی گڑھ کو مینار پاکستان سے مربوط کرتے ہیں کہ علی گڑھ کی بنیادوں کے ساتھ ہی مینار پاکستان کی بنیاد کا راستہ بھی طے ہونا شروع ہوا۔ واقعے کی پوری جزئیات نگاری سے سب واقعات باہم مربوط کرکے کڑیوں سے جوڑتے ہیں اور تین شخصیات کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں، سرسید احمد خان، علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح۔ کتاب کا یہ حصہ تاریخی روئداد پر مشتمل ہے جہاں مختلف مدارج ست تحریک کی بات کی گئی جس کے پہلے درجے میں علی گڑھ اور دوسرے میں تقسیم ہند کی قرارداد منظور ہوتی ہے۔ یہاں سے انقلاب کی کمان نوجوان نسل کے ہاتھوں میں آجاتی ہے جن میں اکثریت علی گڑھ کے فیض یافتہ ہیں۔

باد مخالف کی تندی کبھی کبھار ہمت پست کرنے کے بجائے اونچا اڑانے کے کام آجاتی ہے۔ اگلے صفحات میں مصنف اسی حقیقت کی عملی تفسیر بیان کرتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے مخالفین نے بھی اس کے بنیادوں کو پختگی فراہم کرنے میں مدد کی کہ اگر انگریز و ہندو اتنی شدید مخالفت نہ دکھاتے تو مسلمان بھی شاید اتنے شدید رد عمل کا مظاہرہ نہ کرپاتے۔ پاکستان کا نام اگرچہ اس وقت کے سیاسی ماحول میں موجود تھا لیکن باقاعدہ منتخب نہیں ہوا تھا، ایسے میں ہندوؤں نے ہی پہلی بار قرار داد لاہور کو قرار داد پاکستان کے نام سے موسوم کرکے ہندو پریس کے زریعے اچھالا جس پر مختار مسعود لکھتے ہیں :

"مینار پاکستان کی بنیادوں کو تحریک کے مخالفین سے بھی فیض پہنچا ہے۔ اکثریت کی بد اندیشی نے مسلمانوں کے لئے جو کنواں کھودا تھا وہی مینا ر کی بنیاد کے کام آیا۔"

ہندوں کی مخالفتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ عالمانہ مگر شائستہ طنز کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے حوالے سے اپریل 1947 کو خبر چھپی کہ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ:

"میں اب تک پاکستان کا مطلب نہیں سمجھا"

مصنف یہاں ازراہ تفنن رقم کرتے ہیں کہ:

"کسی نے جواب دیا زرا چند ہفتے توقف کریں تو مطلب نقشے پر عیاں ہو جائے گا"

مسلمانوں کی طرف سے مخالفت کا ذکر بھی وہ مینار پر چڑھتے ہوئے عالمانہ طنز اور تشبیہات سے کرتے ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ہر واقعے کے کئی پہلو ہوسکتے ہیں اور ممکن ہے جس پہلو سے ایک انسان کو کوئی چیز نظر آئے دوسرے پہلو سے نظر نہ آئے۔ ایسے میں مصنف کا طنزیہ لہجہ قاری کو جانبداری کا احساس دلاتا ہے

حالانکہ اس وقت کے علماء کی رائے حالات و واقعات کے مطابق تھی جس سے اختلاف رائے کیا جاسکتا تھا لیکن مصنف قائد اعظم سے عقیدت میں ان سے ہر اختلاف رائے رکھنے والے کو دشمن متصور کیے ہوئے ہیں، لکھتے ہیں :

"ایک ساتھی نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دو چار پرندے دیکھ لیے، کہنے لگے یہ کیا ہے، عرض کیا یہ پرندہ ہر مینار پر بسیرا کرتا ہے۔ انہیں دن میں کچھ نظر نہیں آتا اور ویسے بھی الٹا لٹکا ہونے کی وجہ سے انہیں ہر چیز الٹی نظر آتی ہے۔ ساتھی کہنے لگے، ان کا قصہ چھوڑو یہ بتاؤ کہ خود مسلمانوں نے اس تحریک کی کتنی مخالفت کی تھی۔ میں نے کہا، یہ مخالفت کا تیسرا رخ تھا۔ مندر اور کلیسا کے بعد۔ کچھ مخالفت ڈیڑھ اینٹ اینٹ کی مسجدوں سے بھی ہوئی۔ ایک قوم پرست مسلمان وزیر اعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو جتنا ایمان گاندھی پر تھا اگر اسی قدر اللہ پر ہوتا تو ولی اللہ ہوتے۔ علماء کا ایک قافلہ بھی راہ میں بھٹک گیا تھا۔ "

صاحب کتاب کا شاعرانہ تخیل تاریخی واقعات کو اتنا خوش شکل کرکے پیش کرتا ہے کہ قاری حال سے مستقبل میں جینے لگ جاتا ہے اور واقعات میں چھپے حقائق تک پہنچنے میں مصنف کے زیرسایہ قریب ہوجاتا ہے۔ اگرچہ مختار مسعود کے بقول مینار پاکستان کا یہ مضمون طویل مختصر ہے لیکن درحقیقت یہ بھی کافی طویل ہے جس کی طوالت داستانی شکل نے گراں بار نہیں ہونے دی ہے۔ آخر تک دلچسپی برقرار رکھنے اور قاری کو مضمون کے ساتھ جڑے رکھنے کے لیے مصنف کئی تکنیک کا استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ بنیادی طور پر تین اہم اجزاء کے گرد یہ ڈرامائی تیکنیک گھومتی ہے۔ پہلے جزء میں اس اجلاس سے شروعات کرتے ہیں جو مجلس تعمیر کی ہے۔ اس سے منظر تبدیل کرکے میناروں کے سفر پر قاری کو لے جاتے ہیں اور دنیا کے تقریبا سب اہم اور غیر اہم میناروں کی سیاحت کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے جزء کی طرف بڑھتے ہیں جس میں اس عظیم الشان جلسے کا ذکر ہے جو 23 مارچ 1940 کو ہوا۔ یہ ذکر روایتی تاریخ دانی کی طرح نہیں بلکہ واقعات کے موثر بیان سے اس جزء کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔ مہاجرین کا ذکر، مینار پاکستان کی تعمیر کا سلسلہ اس کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور کہانی آگے بڑھ کر تیسرے پڑاؤ میں آجاتی ہے۔ یہاں پر قائد اعظم اور دوسری نمایاں شخصیات قیام پاکستان کے خواب کو تعبیر کرنے میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ تحریک پاکستان اور قیام کی کہانی کو پیش کرنے کا یہ انداز اچھوتا ہے جس کے مختلف اجزاء کا آپس میں ربط قائم کرنا کٹھن ہے لیکن مختار مسعود نے ماہرانہ فنکاری اس ربط کو برقرار رکھتے ہوئے قاری کی فکر کو جھنجھوڑ کر اس مضمون کا اختتام کیا ہے۔

قحط الرجال:

آواز دوست کا دوسرا مضمون "قحط الرجال" ہے جو طویل تر ہے۔ اس پر اردو ادب کے مختلف اصناف کی تعریف صادق آتی ہے کہ یہ خاکہ نگاری، تاریخی سفر نامہ، رپورتاژ یا آٹوگراف البم کی کی کہانی کے صفات پر پورا اترتا ہے۔ مضمون کی تصنیف سقوط مشرقی پاکستان کے دنوں کی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سقوط بغداد کے بعد یہ ملت اسلامیہ کے لیے دوسرا بڑا سانحہ ہے۔ اس ابتلائی دور میں کہ جب ہر نفس حواس باختہ و پریشان، نا امید و

مایوس تھا ہر طرف بڑے آدمیوں کی کمی شدت سے محسوس کی گئی۔ ایسے میں مختار مسعود نے نابغۂ روزگار ہستیوں کا ذکر چھیڑ کر محفل عبرت بپا کی اور اس تشنگی کے احساس کو مزید بڑھاوا دیا۔ مضمون کا ابتدائیہ جو مصنف کی پہچان بن گیا تھا انتہائی متاثر کن، حیرت انگیز اور گہرائی و معنویت کی ایک دنیا لیے ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی۔ مرگ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیات بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔ اس وبا میں آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ مردم شماری ہو تو بے شمار، مردم شناسی ہو تو نایاب۔"

عظیم لوگوں کی کمی کا احساس مصنف کو شدت سے ہے اور وہ اس میں اپنے قاری کو بھی شامل کردیتا ہے۔ آٹوگراف البم اٹھائے وہ بڑے آدمیوں کی تلاش میں سرگرداں ہے اور قاری بھی یہ جاننے کے لیے بے چین ہے کہ ان کی نگاہ انتخاب اب کس پر ٹھہر کر کیسی خوبصورتی سے وہ بیان کرتی ہے۔ رجال کار کی ناپیدی کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ آٹوگراف البم کی کہانی اس وقت شروع ہوئی جب میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور ایک دن ایک چینی مسلمان عالم ہمارے گھر چائے پر مدعو ہوئے۔ والد محترم نے ان سے ملنے اور آٹوگراف لینے کا حکم صادر فرمادیا تو ان سب باتوں اور آداب سے ناآشنائیت کے باوجود البم خرید کر لایا اور ان سے آٹوگراف لیا۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ سطریں اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہیں لیکن حیرت تب دور ہوئی جب پتہ چلا ہر اچھی بات الہامی ہوتی ہے اور ہر الہام ناشل ہوتا ہے۔

چینی عالم سے دستخط لینے لینے کے بعد اب نیا مرحلہ مزید بڑے لوگوں سے آٹوگراف لینے کا تھا لیکن بڑے آدمی کون ہیں اور کن کے اقوال سے اس البم کے صفحات بھرے جائیں۔ یہاں پر مختار مسعود اپنے والد سے مشورے کے طلب گار ہوئے تو انہوں نے ایک مختصر مگر جامع اصول بتلادیا کہ:

"آٹوگراف البم کے صفحات ہوں یا زندگی کا ورق سادہ، انہیں یونہی نہیں بھرنا چاہیے۔ جاؤ نگہ انتخاب کو کام میں لاؤ، بڑے آدمی زندگی میں کم کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ "

نصیحت صاحب کتاب نے گرہ باندھ لی اور ساری زندگی نگہ انتخاب کو کام میں لاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی البم کے اکثر صفحات خالی رہ گئے ہیں۔ اس معاملے میں وہ اصولوں پر سمجھوتے کے قائل دکھائی نہیں دیتے اور نہ ہی وقتی پسندیدگی البم تک لوگوں کے قلم کو دسترس دیتی ہے۔ ہر پیمانے سے تول کر، ہر طرح سے دیکھ کر وہ آٹوگراف لیتے ہیں۔ عظیم لوگوں کی دریافت کے لیے وہ کتابوں میں انہیں ڈھونڈتے ہیں۔ بچوں کی کہانیوں میں اسے ولندیزی بہادر بچے کی داستان ملتی ہے۔ جرأت اور بہادری سے جو قوم کو غرق آب ہونے سے بچا لیتا ہے تب وہ آگے اس راز سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ بڑے آدمی کون ہیں :

"ان میں سے ہر شخص نے دنیا کو جس حال میں پایا اس سے بہتر حال میں چھوڑا اور یہی بات انہیں عام آدمی سے ممتاز کرتی ہے۔ "

بچوں کی کہانیوں سے لڑکوں کی کتابوں تک سفر کے اس روئداد میں وہ جگہ جگہ ادب کے موتی بکھیرتے، علمیت کے خزانے لٹاتے نظر آتے ہیں۔ عظیم لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں، اہل شہادت، اہل احسان اور اہل جمال۔ اہل شہادت کی خاصیت حکمت ملنے پر جنوں گردانتے ہیں، اہل احسان کی خیر کثیر اور اہل جمال کی حسن۔ زندگی کے امکان کو ایک گروہ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، توانائی دوسرے اور تابندگی تیسرے گروہ کے ساتھ ان میں امتیاز کے لیے رقم طراز ہیں :

"بچوں کی کہانیوں سے مجھے جرأت اور قربانی کا نشان ملا اور لڑکوں کی کتابوں سے مجھے حکمت اور خدمت کا پتہ چلا۔ پہلے گروہ کے لوگ شہید کہلاتے ہیں اور اس دوسرے گروہ میں جو لوگ شامل ہیں انہیں محسنین کہا جاتا ہے۔ اہل شہادت اور اہل احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لیے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے اور دوسرے کا تحفہ زندگی، ایک سے ممکن وجود میں آتا ہے اور دوسرے سے اس توانا وجود کو توانائی ملتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہوتا ہے جو اس توانا وجود کو تابندگی بخشتا ہے، جو لوگ اس آخری گروہ میں شامل ہوتے ہیں وہ اہل جمال کہلاتے ہیں۔ "

عظیم لوگوں کی ناپیدی پر شکوہ کناں مصنف اگلے صفحات میں عظیم لوگوں کی خوبیاں گنواتے ہیں اور 1870 کی دہائی کو عظیم لوگوں کی پیدائش کو دور قرار دیتے ہیں۔ یورپ میں چرچل، لینن، سٹالن اور برصغیر میں قائد اعظم، علامہ اقبال، محمد علی جوہر، ظفر علی خان کا ذکر کرتے ہیں کے 1920 سے 1945 تک ربع صدی میں دنیا کا ہر بڑا کام ان کے بغیر نہ چل سکتا تھا لیکن اب ان جیسے لوگ پیدا ہونے ہی بند ہوگئے۔ بیسیویں صدی کے ابتدائی بیس سالوں میں پیدا ہونے والی کھیپ سے توقعات رکھتے ہیں لیکن جب وہ بار آور نہیں ہوتیں تو کیا ہی تاریخی الفاظ میں ان کا ماتم کرتے ہیں کہ:

"شاید ان بیس سالوں میں مائیں صرف افسر اور تاجر ہی جنتی رہیں۔ ممکن ہے قدرت اس فیاضی کا جو اس نے انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں دکھائی تھی حساب لے رہی ہے، جو ملک اور قومیں اس میزان پر پوری اتریں انہیں مزید بڑے آدمی عطاء ہوئے اور جو ناکام رہیں انہیں سزا کے طور پر ایسے لوگ ملے جو شامت اعمال ہوا کرتے ہیں۔ "

آٹوگراف البم کے صفحات کو جن کا قلم زیر کر پایا ان میں محمد ابراہیم شاکیو چن (چینی مہمان)، نواب بہادر یار جنگ، ای ایم فاسٹر (انگریزی ناول نگار)، ملاواحدی، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، سید عطا اللہ شاہ بخاری، نواب حمید اللہ، راجہ صاحب محمود آباد، سروجنی نائیڈو، ارنلڈ جے ٹائن لی اور قائداعظم محمد علی جناح کے نام اس فہر ست میں نمایاں ہیں۔ قحط الرجال مختصر شخصی خاکوں سے مزین ایسا مضمون ہے جس میں فن اور فکر کی اڑان اونچائیوں پر ہے۔ ہر خاکے کے اختتامی کلمات میں آنے والی شخصیت کا مختصر تعارف کیا جاتا ہے جو کے ربط باہم کا کام کرتا ہے۔ قحط الرجال کے تمام خاکوں میں شخصیات کے ساتھ مصنف اپنی ذہنی و جذباتی وابستگی کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ مثلا مولانا آزاد کو بڑا ماننے کے باوجود بھی ان کے ساتھ ایک نفرت کا لطیف احساس

رکھتے ہیں، حسرت موہانی کے ساتھ طرز زندگی، بہادر یار جنگ کے ساتھ تحریک اور قائد اعظم کے ساتھ سر تا پا محبت کا احساس موجزن ہے۔ الغرض کردار نگاری کے جملہ محاسب اور جزئیات نگاری کی تمام باریکیاں قحط الرجال میں اوج پر نظر آتی ہیں۔

قحط الرجال میں ابراہیم شاکیو چن کے بعد بہادر یار جنگ کا احوال ہے۔ اس کی بے مثال خطابت کے مصنف اسیر نظر آتے ہیں اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واری ہو رہے ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں سیرت کے عنوان پر ان کی پہلی تقریر اسکول میں سنی اور دل میں بسا لیا۔ تفسیر قرآن، سیرت نبوی اور کلام اقبال کو ان کی فکر کی وسعت کا زریعہ گردانتے ہیں، خصوصا سیرت نبوی کو ان کی سیاسی بصیرت کا ماخذ سمجھتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"بہادر یار جنگ کی سیاسی بصیرت کا یہ حال تھا کہ جس رائے کا برملا اظہار کیا وہ صحیح نکلی اور جس خطرے کی علی الاعلان نشاندہی کی وہ درست ثابت ہوا۔ "

مصنف کی بات کو تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ قریبا صدی قبل بہادر یار جنگ نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا اور مصنف نے جنہیں نصف صدی قبل قلم بند کی تھا وہ علی کل مصداق آج حرف بہ حرف پورے نظر آتے ہیں۔ بہادر یار جنگ ایک موقع پر قائد اعظم کو مخاطب کرکے کہتے ہیں جس کو مصنف نے ان الفاظ کے ساتھ سپرد قرطاس کیا ہے کہ:

"قائد اعظم کے سامنے ایک بار یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان کا حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا پاکستان کو پاکستان بنانا مشکل ہوگا۔ "

اس خاکے کا اختتام وہ بہت جذباتی انداز میں کرتے ہیں جب ان کے دوست اور وہ مل کر ان کی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے موقع پر 26 دسمبر 1943 کو کی گئی تقریر کا تجزیہ کرتے ہیں تاکہ ماضی سے اتفاق کی راہ نکلے۔ دونوں اس فیصلے پر پہنچتے ہیں کہ نواب بہادر یار جنگ ایک عظیم خطیب اور ایک عظیم تر انسان، گفتار میں فرد اور کردار میں مرد تھے جس کے صحیح مقام اور منزل کو ہم نہ پہچان سکے۔

اگلا خاکہ انگلستان کے مشہور ادیب ایم-وی-فاسٹر کا ہے جس کے ابتدائیے میں نواب بہادر یار جنگ کی شعلہ بیانی کے بعد اس انگریز ناول نگار کے ٹھہراؤ سے متاثر ہونے کا ذکر ہے۔ جون 1978 کی سہہ پہر میں ریڈیو پاکستان کی ایک مختصر خبر جس میں فاسٹر کے موت کی خبر تھی سے بات آگے بڑھاتے ہیں اور آٹوگراف البم میں موجود ان کے دستخط کا تجزیہ کرتے ہیں۔ فاسٹر کی خدا ترسی اور مسلم پسندی کو ان کا سرمایہ گردانتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اسے مسجد میں اسلام کی سادگی اور سلامتی کا پیغام بھی ملا اور خود فراموشی اور خدا شناسی کا مقام بھی، خانۂ خدا نے اس کے دل میں گھر کرلیا۔ "

فاسٹر کے ناول نگاری پر بات کرتے ہوئے خوبصورت چھوٹے چھوٹے فقروں سے قارئین کو جکڑ لیتے ہیں۔ ان کی نفسیات دانی کی مہارت اس خاکے میں عروج پر نظر آتی ہے اور اس وقت کی انگریز غلامانہ ذہنیت کے تار و پود بکھیرنے لگتے ہیں۔ اس کے ایک ناول کا تجزیہ کرتے ہوئے دنیا جہان کی تاریخ کا احاطے کرتے ہوئے اختتامیہ میں لکھتے ہیں :

"میں نے ناول ختم کیا تو یوں لگا گویا یہ کسی صوفی فلسفی اور عاشق کی لکھی ہوئی مثنوی ہے، محض ادیب اور ناول نگار ان بلندیوں تک کہاں پہنچتا ہے۔ "

فاسٹر کے در سے ہوتے ہوئے مصنف ایک اور خاکے کی طرف نکل پڑتے ہیں جو اپنے پیش رو خاکوں سے نسبتا طویل ہے اور ملا واحدی سے مختار مسعود کی محبت کا بین ثبوت ہے۔ ان کے تین خصوصیات، عبارت، ادارت اور رفاقت مصنف کے زیر نظر ہیں اور نپے تلے فقرات کے دریا سے فصاحت کے سمندر میں قاری کو غرقاب کرتے ہوئے قرطاس پر قرطاس بھرتے جارہے ہیں۔ خاکے کے ذیل میں ملا واحدی کے پیر و یار خواجہ حسن نظامی کا تذکرہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ نوائے وقت میں ایک کالم سے ملا واحدی کو جاننے سے ملنے کے سفر کی یہ داستان مفرس و معرب ہے۔ ان کے طرز تحریر کی خوبصورتی کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مغلیہ تہذیب کی وراثت، خاندانی شرافت کا سرمایہ، مرشد کی خاص عنایت، مشاہیر ہر وقت تعلق، لکھنے پڑھنے کا شوق اور کاروبار، محنت کی عادت، معاملگی کی دیانت، عہد کا پاس، عروس البلاد سے وابستگی، دین کا ذوق، حضور کی محبت اور خدائے بزرگ و برتر کے فضل و کرم پر ایمان کام حاصل ہو تو لکھنے والے کی ذات تحریر کے ہر لفظ اور فکر کے ہر انداز میں جھلکتی ہے۔ ساری عمر ایک خاص ڈھب سے بسر ہو تو سوچ کا یہ ہمی گیر مگر پختہ اور یکساں انداز نصیب ہوتا ہے۔ "

بات ان کے جملہ محاسن سے ہوتے ہوئے نکلتی ہے اور کراچی کے حالات پر آجاتی ہے۔ مصنف کے عمیق مشاہدے کی قوت یہاں صاف نظر نے لگتی ہے اور کڑی سے کڑی جوڑتے ہوئے موسم کے اعتدال سے اڑان بھرتے انسانی مزاج کے تلون پر تان ٹوٹتی ہے۔ مفتی کفایت اللہ کا تذکرہ زیر قلم کرتے ہوئے دیوبند کی طرف نکلتے ہیں اور علی گڑھ کے ساتھ اس کی قربت و دوری کے واقعات بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔

کراچی، دیوبند اور علی گڑھ کے بعد دلی کی باری آتی ہے تو تاریخ کے در وا ہونے لگ جاتے ہیں۔ پرانی دلی سے ہوتے ہوئے بات اس کے صنعتکاروں کی طرف جا نکلتی ہے اور مدن موہن پر پہنچ جاتی ہے جن کے ساتھ مصنف کی بچپن کی شناسائی ہے۔ صنعتوں پر سیر حاصل گفتگو کے بعد وہ واپس اپنے موضوع ملا واحدی کی طرف آتے ہیں اور ان کے خاندان کی شرافت کو قارئین کی بصارتوں کی نظر کرتے ایک بہت ہی خوبصورت تمہید کے ساتھ اس خاکے کا اختتام کردیتے ہیں۔

ملا واحدی کی نصیحت "بولنے'لکھنے اور ہر کام کرنے میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس سے دین یا دنیا کا کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں " کا مصداق ڈھونڈتے ایک ایسے شاعر کے در پر رکتے ہیں جن کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں

گزرا۔ انقلاب کی راہ میں اپنا گھر بار، مال و دولت، قلمی نسخے، کتب خانہ اور جوانی لٹانے والے کے عزم و ہمت سے متاثر نظر آتے ہیں کہ اس شخص نے فرنگ کے دبدبے کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دی۔ یہاں تک کہ دوران قید ان کا لخت جگر بیمار ہوا، جیل والوں نے کوئی اطلاع نہ اور جب ان کا انتقال ہوا تب بھی حاکمان جیل خاموش رہے۔ بلائیں تمام ہوگئیں تو اس باکمال شاعر نے کہا:

جو چاہے سزا دے لو، تم اور بھی کھل کھیلو

پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی

حسرت موہانی، مصنف کے لیے آٹوگراف کا انتخاب بن گئے کہ جنگ آزادی میں یہ شاعر ہر محاذ پر پہلی صفوں میں ملتا ہے۔ مصنف کو ان کی مجموعہ اضداد زندگی پسند آتی ہے۔ خاکے میں اسی سے رنگ بھرتے جاتے ہیں اور آخر میں قارئین کو پتہ چلتا ہے کہ مصنف سے ان کا تعارف ریڈیو پر چلنے والی ایک غزل کے ذریعے ہوا، ان دیکھے کی چاہت دیکھنے اور ملنے پر منتج ہوتی ہے۔ حسرت کا یہ خاکہ طویل مگر دلچسپی سے بھرپور ہے کہ مصنف نے شعر و سخن کے میدان کو بھی بحث میں سمو دیا ہے اور قاری سے داد لیتا ہے۔ اختتامیہ میں دستخط کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"فقیر حسرت موہانی 2 دسمبر 1943ء۔ فقیر کے نقطے نہیں اور موہانی تو صرف شوشے دار نصف دائرہ اور ایک ٹیڑھی لکیر ہے۔ نقطے نہ سہی، وہ شخص نکتہ سنج تو تھا۔ لکیر سیدھی نہ سہی، وہ خود تو ساری عمر صراط مستقیم پر چلتا رہا۔ دستخط بد خط سہی، وہ شاعر خوش نوا تو تھا۔ "

اگلا خاکہ حسرت موہانی کے ایک ہم عصر شاعر و ادیب کا ہے جو حسرت ہی کی طرح گرفتار بلا رہے۔ صحافت، خطابت اور بغاوت کی وجہ سے ناموری پانے والے مولانا ظفر علی خان مصنف کا آٹوگراف کے لیے اگلا انتخاب ہیں۔ ان کے ذکر کے ساتھ ان ہی کے ہم عصر مولانا محمد علی جوہر کا ذکر چلتا ہے، علی گڑھ کی بات ہوتی ہے اور اخبارات پر ٹھہرتی ہے۔ ظفر علی خان کے کلام کا تجزیہ ہوتا ہے اور بات آگے بڑھتی ہے۔ بالاخر مصنف علی گڑھ ہی میں منعقدہ ایک جلسے کے اختتام پر موصوف سے آٹوگراف حاصل کرلیتے ہیں اور اس طویل خاکے کو ختم کرتے ہیں۔

تحریک پاکستان کے دنوں میں قحط الرجال نہیں تھا بلکہ رجال کار کی فراوانی تھی۔ کوئی تحریر میں یکتا تو کوئی تقریر میں بے بدل، ایسے ہی ایک خطیب بے مثال مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا خاکہ اگلے حصے میں قرطاس کی زینت بنتا ہے۔ احراریوں سے اختلاف کے باجود ان کے سرکردہ سے مصنف مرعوب نظر آتے ہیں۔ اپنے پیشے کی مجبوری تقریر سننے میں آڑے آتی ہے تو شاہ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور کچھ بحث و تمحیص کے بعد شاہ صاحب مصنف کے دولت کدہ کو رونق بخشتے ہیں۔ خاکے میں بنیادی رنگ اسی ملاقات کی روئداد ہے مگر تذکرہ مشاہیر بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ان سے چند سوالات کے ساتھ مجلس ملاقات ختم ہوتی ہے اور خاکہ بھی اختتام پذیر ہوجاتا ہے۔ ان کی خطابت کے بارے میں لکھتے ہیں :

"وہ خطابت کس پائے کی ہوگی جسے مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور بہادر یار جنگ کا زمانہ ملا پھر بھی سب پر بھاری رہی۔ "

جاپانیوں کی باغبانی سے اگلے خاکے کا ابتدائیہ لکھتے ہیں۔ امریکہ، جاپان، جمہوریت اور باغبانی سے ہوتے ہوئے بات نوابوں کے عادات و خصائل پر ٹھہرتی ہے۔ ذکر اگلے آٹوگراف کا چھڑتا ہے اور نام نواب حمید اللہ خان کا آتا ہے۔ ان کی سادہ مزاجی اور نفاست کے حسین امتزاج کو بیان کرتے ہوئے خاکے کو دعائیہ اختتام دیتے ہیں۔

نوابوں کے بعد راجاؤں کا ذکر آتا ہے تو ایک ایسے راجہ کا ذکر ملتا ہے جو بقول مصنف جاگیر بھارت میں چھوڑ آئے، سیاست پاکستان آکر ترک کردی، ہوشمندی ہنوز ان کے ساتھ ہے مگر دردمندی کا پتہ نہیں ملتا۔ خاکہ راجہ آف محمودآباد کا ہے جو بظاہر بانکے نظر آتے ہیں لیکن جوشیلی تقریر سے مصنف کا دل موہ لیتے ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے تو راجہ صاحب کی پاکستان میں خاموش مزاجی موضوع بن جاتی ہے کہ تحریک پاکستان میں پرجوش راجہ پاکستان بننے کے بعد یکایک کیوں گمنامی کی زندگی کو ترجیح دینے لگے۔ مصنف ان کی تبدیلی کا راز جاننے اس سے ملاقات کی طلب رکھتے ہیں جو بالاخر اگست 1970 کو پوری ہوجاتی ہے۔ اس ملاقات میں کچھ ایسے انکشافات ہیں جو قارئین کو جھنجھوڑ ڈالتے ہیں۔ مثلا قائد اعظم کی بیماری، پاکستان کے اصل نقشے کے بجائے کٹے پھٹے حدود اربعہ پر اکتفاء اور مسلم لیگ کی نا اہلی۔ راجہ صاحب کے زبان میں مسلم لیگ نے پاکستان نہیں بنایا، مسلم لیگ کہاں اتنی منظم تھی کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتی۔

قاری کو سوچتا چھوڑ کر اگلے خاکے میں اپنے البم کے اکثر خالی صفحات کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ ایک سیاہ بلی کے واقعے سے قارئین کو اپنی کیفیت سمجھاتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد سے اپنے ناپسندیدگی اور پسند کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی تقریروں اور بیانات کا تجزیہ کرتے ہوئے تلخی کو قاری محسوس کرتا ہے اور جانبداری کی طرف دھیان جانے لگتا ہے۔ انگریزوں سے ملکہ ایلزبتھ کی داستان پر آتے ہیں اور وہاں سے چین کا ذکر، انقلاب چین کا احوال اور ماؤزے تنگ سے آٹوگراف لینے کی خواہش کے ساتھ مختلف لوگوں کے تذکرے چلتے ہیں۔ یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کا تذکرہ ہے، اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری اوتھانٹ سے اول وہلت میں کدورت اور بالاخر ایک واقعہ سے متاثر ہونے کا ذکر ہے اور آخر میں اپنے ہی ایک آٹوگراف کی روئیداد ہو جو ایک بظاہر ماڈرن نظر آنے والی لڑکی کو دیا۔

آخری تین خاکے بہت طویل ہیں اور مصنف کی قلبی رغبت کو ظاہر کرتے ہیں، پہلا سروجنی نائیڈو کا ہے اور آخری قائد اعظم محمد علی جناح کا۔ اس خاکے میں ادبیت، خوبصورت تلمیحات اور استعارات نیز شاعرانہ بانکپن عروج پر ہے، ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے:

"کعبۂ دل میں جھانکا تو دیکھا کہ ایک صنم نے وہاں گھر کرلیا ہے۔ ہمیں گمان تھا کہ دور آزری ختم ہوئے مدت بیت چکی ہے اور اس عرصہ میں دل اگر صحن مسجد نہیں بن سکا تو کیا غم کم از کم بتکدہ تو نہیں رہا۔ "

سروجنی کا مسلمانوں سے تعلق، تقریر پر گرفت، علی گڑھ آمد اور یونین ہال میں جلسے سے خطاب کو مصنف انتہائی والہانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ خود لکھتے ہیں کہ ایک بار ان کی والدہ نے کہا:

"کون ہے یہ کافرہ کہ جب جوان تھی تو باپ گرویدہ تھا اور بوڑھی ہوئی تو بیٹا شیدا ہے۔ "

پورا خاکہ سروجنی کے سر و قامت سے ہوتا ہوا ان کی مسلم یونیورسٹی آمد کے پس و پیشت گھومتا ہے۔ اس وقت مسلم یونیورسٹی پر تفکرات اور بے یقینی کے سائے چھائے تھے۔ بقول مصنف ہر شخص اس حقیقت سے واقف تھا کہ کہ ایک منزل سر ہوچکی ہے اور اب کتنے ہی بے گناہ سر اس کی پاداش میں کٹ جائیں گے۔ تعجب اس بات پر تھا کہ یہ قربانی اس وقت طلب ہوئی جب ہم منزل پر پہنچ چکے تھے۔ ایسے میں سروجنی کی تقریب میں شرکت سے ماحول تھوڑا امید افزا ضرور ہوا مگر جب اس نے تقریر کا پہلا جملہ کہا تو ماحول پر سکوت چھا گیا، اس کے ساتھ آنے والے گنگ رہ گئے اور اس نے ببانگ دہل اپنی حمایت اور شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا عزم دھرایا۔ ان کی تقریر کے جزئیات پر مصنف خاکے کو آگے بڑھاتے ہیں، تقریر کے عناصر ترکیبی پر بات کرتے ہیں اور سروجنی کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ پروفیسر ہادی حسن کا تذکرہ درمیان میں آتا ہے کہ کس طرح وہ ان کے سامنے تقریر میں توقعات پر پورا نہ اترسکے۔ پروفیسر صاحب کی زندگی اور اس کے ساتھ گزرے لمحات سے قارئین کو آگاہی دینے کے بعد موصوفہ سے اپنے پہلے تعارف کا واقعہ بتلاتے ہیں۔ پہلا جلسہ اور اس میں ایک لڑکے کا سروجنی کے لیے خیرمقدمی تقریر کی تمہید کا ذکر ہے جس کو مصنف نے ترجمہ کرکے کچھ یوں لکھا ہے:

"اس خوشرنگ اور روشن شخصیت کے استقبال کے لیے حاضر تو ہوگیا ہوں مگر سوچتا ہوں شروع کہاں سے کروں، اس خطابت سے جسے کوئی نہ پہنچ سکا یا اس محبت سے جو ہر ایک کے حصے میں آئی۔ "

شاعری کی تمام تشبیہات سے مزین اس خاکے میں جزئیات نگاری بھی حدوں پر ہے۔ سروجنی کے نشست پر بیٹھنے کے انداز سے لے کر تقریر کے لیے آنے تک، تقریر کے جملوں میں احساسات کے اتار چڑھاؤ سے لے کر تاثرات کے اظہار تک سب کا عمیق جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف ان کی تقریر کے حد درجہ اسیر نظر آتے ہیں کہ بار بار دو چار پیرائیوں کے بعد مختلف استعارات سے ان کی تقریر کو بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔ سروجنی سے آٹوگراف لینے کا واقعہ اور اس کے سامنے کی گئی خود کی تقریر کا بڑے مزے سے ذکر کرتے ہیں اور اس کی اسلام پسندی پر آنکلتے ہیں۔ خواتین سے ان کی کی گئی تقریروں میں سے اسلام کے حوالہ جات نقل کرتے ہیں اور اس دورانیے میں کی گئی سب اہم تقریروں کے خلاصے پیش کرتے ہیں۔ ہندو مسلم تعلقات پر سروجنی کا حوالہ دیتے ہیں اور ان تعلقات کی تاریخی حیثیت کو زیر قرطاس لا کر سروجنی کو ایک خواب سے تشبیہ دے کر خاکے کا اختتام کرتے ہیں۔

یہ خاکہ سب سے طویل ہے، ابتدائیہ میں 1857 سے شروع ہوئے اس سفر کو 1947 تک لا پہنچاتے ہیں اور ابتدائیہ میں ہی قیام پاکستان کے ساتھ متصل 1958 اور 1971 کا ذکر ہے کہ جس ملک کے لیے اتنی طویل تحریک چلی وہ محض چند سالوں میں ہی حکمرانوں کی غفلت سے دو لخت ہوگیا۔ یہاں اسلام اور مسلمانوں کی زندگی پر فلسفیانہ انداز سے قارئین کو ان اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہیں جس میں اقوام کی بقا پوشیدہ ہے۔ تہذیبوں کا عروج اور

تاریخ انسانی کے جائزے سے بات ہوتے ٹائن بی تک آپہنچتی ہے اور ان کے اقوال اور مشاہدات، زندگی اور طرز زندگی سے آگے بڑھتی ہے۔ ٹائن بی کے نظریات کا تقابل ہوتا ہے، نظریہ مجاہدہ کا تجزیہ کرتے ہیں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی وجوہات قاری کے سامنے لے آتے ہیں۔ اس خاکے میں مصنف تاریخ کا ایک ایسا عالم نظر آتا ہے جس کو ہر تہذیب اور ادوار سے آگاہی ہے اور وہ اس آگہی میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔ زوال کی صورتوں پر بحث سے بات آگے بڑھتی ہے، پہلی سے چھٹی صورت تک ہر ایک کا تجزیہ ہے، محاکمہ ہے اور اس کے بعد ٹائن بی کی تاریخ دانی کے تذکرے کی طرف ورود ہے۔ یہ خاکہ ان تین طویل خاکوں میں شامل ہے جن شخصیات سے مصنف از حد متاثر نظر آتے ہیں۔ متاثر ہونے کی وجوہات کی طرف آگے چل کر خود اشارہ دیتے ہیں کہ:

"تین آیات کے حوالے سے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ ٹائن بی کی فکر قرآن مجید سے کس قدر قریب اور متاثر ہے۔ "

ٹائن بی کی تصنیفات اور مصروفیات کا ذکر ہے کہ شدید مصروف حکومتی مشاغل کے باوجود اس کا مطالعہ قابل رشک ہے۔ گزرے ہوئے زمانوں کے بے نشاں باشندوں سے دوستی نبھانے کی خاطر وہ راتوں کو جاگ جاگ کر یہ کام سر انجام دیتے رہے اور مصنف سے داد ان حروف میں لی کہ بیدار مغز لوگ راتوں کو بھی بیدار رہتے ہیں۔ تین لوگوں برنارڈشا، چرچل اور ٹائن بی سے مصنف اپنی ملاقات کا اشتیاق ذکر کرتے ہیں اور قاری بے چین ہونے لگتا ہے کہ کب وہ ٹائن بی سے ملیں گے۔ اس حد تک پہنچانے کے بعد وہ اس جلسے کی روئداد ذکر کرتے ہیں جس کے وہ صدر تھے اور ٹائن بی مقرر۔ جلسے کے بعد اس سے نشست ہوتی ہے اور مصنف آٹوگراف البم نکال کر سامنے کردیتے ہیں۔ ٹائن بی نام لکھ کر تاریخ ڈالتے ہیں اور ہجری تاریخ کے لیے مصنف کی طرف دیکھتے ہیں، اور مصنف کی خاموشی سے وہ مشہور عام جملہ وجود میں آتا ہے کہ:

"اسلام کی تاریخ وہ لوگ کیوں کر بنا سکتے ہیں جنہیں تاریخ تک یاد نہ ہو، صرف باتیں بنانے سے کہیں تاریخ بنتی ہے۔ "

آخری خاکہ اس شخصیت کا ہے جس کا ذکر اس پوری کتاب میں جابجا بکھرا پڑا ہے اور جس کے ساتھ مصنف کی عقیدت عشق کی حد تک پہنچی ہے۔ ٹائن بی کے ذکر سے متصل اس خاکے کے شروعات میں شخصیت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

"ٹائن بی تو محض ایک تاریخ دان ہے اور یہ دستخط ایک تاریخ ساز شخصیت کے ہیں۔ "

تمہید میں اپنی اس جملے کے اصل مورد سے قارئین کو آگاہ کرنے کے لیے پیچھے چلتے ہیں اور اسٹریچی ہال میں منعقدہ جلسے سے خطاب کرنے والے شعبۂ تعلیم کے صدر اے-بی-اے-حلیم کے استقبالیہ کا ذکر ہے جو وہ قائد اعظم کے لیے کرتے ہیں۔ کچھ آگے چل کر قائد اعظم کی سیاسی زندگی کی شروعات کا بیان ہے اور اس موقع پر علامہ اقبال کی قائد اعظم سے توقعات کا ذکر ہے کہ ان کو قائد اعظم کی شکل میں مسلمانوں کا نجات دھندہ نظر آیا تھا۔ کڑی سے کڑی ملتی ہے اور علامہ اقبال کے حالات زندگی پر بحث ہوتی ہے، ان سے قاری کو متعارف کرواتے ہیں

اور نظریہ پاکستان پر بات لے جاتے ہیں۔ ہندو مسلم تفریق، مسلمانوں کے جداگانہ تشخص اور اپنے لیے علیحدہ حکومت کے قیام کی کوششوں کا احوال ہے۔ بات ہوتے ہوتے پھر قائد کی طرف مڑتی ہے اور اس کا موازنہ مختلف شخصیات سے کرنے لگتے ہیں، ٹیپو سلطان، اورنگ زیب عالمگیر۔ فتوحات کا تقابل کیا جاتا ہے تو محمود غزنوی کا سومنات، شہاب الدین کا تھانیسر اور احمد شاہ ابدالی کا پانی پت۔ برصغیر کے مسلمانوں کا شیرازہ یکجا کرنے میں قائد اعظم کے کردار پر مفصل بحث قرطاس کی زینت بنتی ہے اور خاکہ مزید واضح ہونے لگتا ہے۔ مصنف اپنے اور قائد کے باہمی تعلق پر بات کرتے ہیں، کہ پہلی بار ان کو کہاں دیکھا۔ یہاں تک بات کرکے وہ اس جلسے کا ذکر کرتے ہیں جس میں انہیں قائد اعظم کا آٹوگراف ملا۔ پورے جلسے کا مفصل ذکر ہے اور آخر میں اس لمحات کی مکمل جزئیات نگاری ہے جب آٹوگراف البم قائد اعظم کی طرف بڑھائی۔

اس خاکے میں قائد اعظم سے جڑے چند مزید شخصیات کا ذکر بھی ہے۔ ان میں متصلا شروعات فاطمہ جناح کے ذکر سے ہوئی۔ ان سے ملاقات کا احوال ہے اور ان سے قائد کی نجی زندگی پر کیے گئے سوالات کا بیان۔ اسی نشست میں لیاقت علی خان بھی زیر بحث آتے ہیں تو مصنف قارئین کو ان کی شخصیت سے بھی روشناس کردیتے ہیں۔ آگے چل کر قائد اعظم کے ساتھ جڑے مصنف کے کچھ مزید واقعات کا ذکر ہے اور پھر تاریخ کے مخفی گوشوں پر بات چیت سے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اختتامیہ میں مصنف بڑی خوبصورتی سے قائد اعظم کی شخصیت کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

"قائد اعظم کی جانی پہچانی شخصیت میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو سمجھ میں نہ آئے۔ شخصیت کے اعتبار سے وہ ایک سیدھے سادھے آدمی تھے۔ ان کی خاص خاص خوبیوں کی فہرست کچھ یوں بنے گی، عزم - عمل - دیانت - خطابت اور خود داری۔ ایسے شخص کو غیروں نے سمجھا مگر مان کر نہ دیا اور اپنوں نے مانا مگر سمجھ کر نہ دیا۔ "

ANS 05

مرزا اسد اللہ خاں غالب 27دسمبر 1797ءمیں دریا گنج آگرہ بھارت میں پیدا ہوئےشعر و ادب کے اس عظیم المرتب شاعر کے خاندان کے متعلق شنید ہے کہ یہ ترک خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد حکومت میں ماورالنہر سے ہندوستان میں آئے تھے۔ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان تھےپانچ سال کی عمر میں یہ عظیم شاعر والد کے سائے سے محروم ہو گیا تھامرزا اسد اللہ غالب کی شادی محض 13سال کی عمر میں امرو بیگم سے ہوئی۔ ان کے ہاں سات بچوں کی ولادت ہوئی مگر ان میں سے کوئی بھی حیات نہ رہا۔ شادی کے بعد غالب نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا۔ اور اپنی شادی کے بندھن کو عمرقید سے تعبیر کیا۔

قید حیات و بند و غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مرزا اسداللہ غالب فارسی اور اردو میں بیک وقت سخن سرائی کرتے تھے۔ اپنے منفردانداز بیان اور طرز تحریر کی وجہ سے اپنے ہم عصر شاعروں میں منفردمقام و پہچان رکھتے۔استاد ابراہیم ذوق اور مومن خان مومن بھی نمایاں تھے ۔

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق

رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

غالب ہمارے ان خوش قسمت مشاہیر میں سے ہیں جن کی شاعری ، شخصیت اور ادبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ با ایں ہمہ اہل علم حضرات کی علمی و ادبی تحقیقات اس باب میں برابر جاری ہیں جس کے نتیجہ میں ہم مرزا غالب کے محسن کلام اور ان کی فنی خوبیوں کے نئے نئے گوشوں سے آشنا ہوتے رہتے ہیں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پسندیدگی اور مقبولیت کے کیا اسباب ہیں؟کہنہ صرف ذی علم حضرات بلکہ معمولی اردو جاننے والے بھی مرزا کی شخصیت اور کلام سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کے بے شمار اشعار اور مقطے زبان میں اس طور پر داخل ہوگئے ہیں کہ وہ زبان ہی کا ایک جز بن گئے ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب

شرم تم کو مگر نہیں آتی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ان اشعار سے ہماری زبان اور کان نا آشنا نہیں ہیں ۔ نجی صحبتوں سے لے کر علمی اور ادبی گفتگو تک ہر موقع اور مقام پر یہ اشعار تکرار کے ساتھ سننے میں آتے ہیں اور لذت کام و دہن میں اضافہ کرتے ہیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مرزا ایک بلند پایہ شاعر تھے توا ن کے معاصرین میں اسی قبیل کے اور بھی شاعر اور باکمال حضرات گزرے ہیں۔ لیکن خاص و عام میں ان کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہے جو مرزا غالب کی ذات کوہے۔

مرزا کی سوانح سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ ابتدائے سن بلوغ سے لے کر عالم پیری و حیات دنیوی کے اختتام تک شدائد و مشکلات کے باوجود جن انوکھے طریقوں سے انہوں نے اپنی بلند شخصیت کا جا بجا اظہار کیا ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی ذات انفرادیت کے احساس سے ہر دم معمور رہتی تھی۔ طرز بیدل میں شعر کہنا بھی

انفرادیت کے شدید احساس کی وجہ سے تھا اور اس کا ترک کرنا بھی اس وجہ سے کہ ان کی انفرادیت نے اپنا ایک خاص رنگ اختیار کر لیا تھا۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

مرزا صاحب کی شخصیت کے مطالعے کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جس قدر عظیم فن کار اور ارباب کمال گزرے ہیں ان میں سے بیشتر کی زندگی اور فن میں کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فن کاراپنی شخصیت و کردار کے کمزور پہلوؤں کو جنھیں زمانے کی معاشرت، اخلاقی قدروں کے منافی خیال کرتی ہے۔

منظراک بلند ی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یوں غالب فارسی اور اردو کے شاعر کے طورپر اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ لیکن نثر میں بھی کمال انداز تحریر اپنایا جو پڑھنے والوں کو تحریر کے اختتام تک جکڑے رکھتا ہے۔ مکاتیب غالب ، مرزا غالب کی پر تاثیر تحریر کے اعلیٰ شاہ پارے ہیں۔ غالب نے ہی خط کو آدھ ملاقات قرار دیا۔ اور خط تحریر کرتے ہوئے ایسا انداز متعارف کرایا کہ گویا جس کے لیے خط لکھا جارہاہے وہ سامنے بیٹھا سب دیکھ رہاہے۔ مرزا غالب بے پناہ صلاحیتونکے مالک اور ظریفانہ مزاج کے حامل انسان تھے۔ حاضر جوابی بھی مرزا غالب کا ایک خاصہ تھی۔ مرزا غالب کو جتنی پذیرائی اس کی کی زندگی میں ملنی چاہیے تھی نہینملی وہ خود بھی اپنے آپ کو آنے والے زمانے کاشاعر کہتے تھے۔غالب کو ایک نئے عد کی تشکیل کا پورا پورا احساس تھا اور وہ جدید عہد کے مضمرات کو قابل قدر جانتے تھے ان کے خیال میں مردہ پروری مبارک کام نہ تھا وہ مستقبل کی جانب نظر رکھتے تھے اور یہ انداز نظر ان کی بالیدگی طبع پر دلیل ہے اور ان کے سماجی مزاج کا ترجمان ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ہم نے مانا کہ نخافل یہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غالب نے اردواور فارسی زبان میں کئی شہکار شعر تخلیق کیے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مرزا اسد اللہ غالب کی خود نوشت یادگاہ غالب کے عنوان سے تحریر کی